غلام رسول مہر اور صبحِ آزادی

محمد حمزہ فاروقی*

اگست ۱۹۴۷ء میں مہر اور ان کا گھرانہ لاہور میں آباد تھا لیکن ان کے بھائی ۱۹۲۷ء سے سناور ضلع شملہ میں رہتے تھے۔خاندان کے دیگر افراد پھول پور اور اس کی نواحی بستیوں میں آباد تھے۔لاہور مہر کا وطنِ ثانی تھا۔لیکن آپ پھول پور کو ہی اپنا وطن قرار دیتے۔امیر احمد خان علوی معاشی اعتبار سے مستحکم تھے۔انھوں نے ٹھیکیداری میں لاکھوں کمائے لیکن فطرتاً شاہ خرچ اور مہمان نواز تھے اور مہمانوں پر بے دریغ روپیہ صَرف کرتے۔انھوں نے کسولی اور ڈکشائی میں دوستوں کا حلقہ قائم کیا تھا ان کے ساتھ مختلف تفریحات میں حصہ لیتے۔ان کے پاس تین کاریں تھیں اور مختلف درجوں میں بیس پچیس ملازم تھے۔شاہ خرچی کی بدولت ان کے پاس زیادہ روپیہ نہ تھا۔فروری ۱۹۴۷ء میں امیر احمد کی صاحبزادی مجیدہ مہر کے بیٹے عبدالسلام اسلم کے نکاح میں آئیں[۱]۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں جب خضر حیات خاں نے وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دیا اور اس کے بعد سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان فسادات شروع ہوئے تو مہر کو اندازہ ہوا کہ کسی خوف ناک طوفان کا سروسامان ہو رہا تھا۔صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر مہر نے سناور سے امیر احمد خان علوی کو مشاورت کے لیے اپریل یا مئی ۱۹۴۷ء میں بلوایا۔مہر نے ان سے کہا اگر لاہور چھوڑنا پڑے تو گھر کے تین مکان شاید ہمارے لیے کفایت نہ کریں، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اسی اثناء میں ایک اور مکان کی بنیاد رکھ لی جائے۔امیر احمد نے جواب دیا کہ بالفعل تو ایسا غیر ضروری ہے، جو مکان موجود ہیں وہ بہرحال کافی ہوں گے اور بعد میں انتظام کیا جاسکتا ہے۔مہر کو سکھوں اور ہندوؤں کے عزائم کا اندازہ تھا۔آپ جالندھر کو لاہور کی نسبت زیادہ محفوظ مقام تصور کرتے تھے۔آپ نے ۲۹ مئی ۱۹۴۷ء کو عبدالسلام اسلم کے نام ایک غیر مطبوعہ خط میں لکھا۔

> یہاں آٹھ روز تک ڈاک میں اتنی ابتری پھیلی کہ الامان۔اب دنوں کے بعد خط ملنے شروع ہوئے ہیں، کاروبار تباہ ہوگیا اب میں تو اس انتظار میں ہوں کہ آپ آئیں تو میں جالندھر منتقل ہوجانے کے متعلق بندوبست کرلوں۔مثلاً ایک مکان یا کوٹھی وہاں کرائے پر لی جائے۔فی الحال ایک سال کے لیے یا آپ فرمائیں تو گھر میں مکان کا مزید ایک حصہ تعمیر کرلیا جائے۔اگرچہ وہ کچا ہی ہو لیکن اس کے سوا چارہ نہیں۔یہاں اطمینان سے رہنا فی الحال محال نظر آرہا ہے۔

* محقق و مصنف، رہائش: مکان نمبر ڈی۔۸۶، بلاک۔۴، کلفٹن۔کراچی

امیر احمد خان لاہور میں ایک دو روز قیام کے بعد جانے لگے تو مخدوش حالات کے سبب یہاں کرفیو لگ گیا۔ مسلم ٹاؤن سے اسٹیشن جانے کے لیے نہر کے ساتھ والی سڑک اختیار کی گئی، اسٹیشن پر ٹرینوں سے لٹے پٹے مسافروں کی آہ و بکا کی دلدوز صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ حالات اس تیزی سے بگڑ رہے تھے کے سفر خطرے سے خالی نہ تھا۔ امیر احمد کا جالندھر میں ایک دن قیام اور عزیزوں سے مشاورت کا ارادہ تھا لیکن ان حالات میں جالندھر میں رکنا خلافِ مصلحت اور بال بچوں کے پاس پہنچنا بے حد ضروری تھا۔ کیوں کہ ان کا دورِ ابتلا و فتنہ انگیزی میں ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان رہنا طوفانی سمندر کے بیچ جزیرے میں رہنے کے مترادف تھا۔

امیر احمد خان کے سناور کسولی اور ڈکستائی میں مکانات تھے ان کا ارادہ تھا کہ اپنے بچوں اور ملزموں کو سناور سے تین چار میل دور کسولی بھیج دیں [۲]۔ انھوں نے سناور پہنچ کر مہر کو ایک دو خطوط میں اضطراب انگیز حالات کی طرف اشارہ کیا تھا، لیکن انھیں اندازہ نہ تھا کہ ہمہ گیر بدنظمی اور فتنہ انگیزی کا دور دورہ ہوگا۔ حکومتیں موجود تھیں، فوج بھی تھی لیکن آنے والے دور میں عوام کے تحفظ جان و مال کا انتظام نہ تھا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو عارضی خط تقسیم کا اعلان ہو گیا، تاہم حکومت فرائض کی بجا آوری میں کلیتاً ناکام رہی۔ پنجاب کے غیر مسلم اکثریتی علاقوں سے مسلمانوں کا محفوظ علاقوں تک زندہ پہنچنا اتفاقی امر تھا۔

مہر نے ۱۰ جولائی ۱۹۴۷ء کو مختار الدین احمد کے نام خط میں لکھا:

> اس ہمہ گیر تباہی کے باعث دل کی جو حالت ہو سکتی ہے وہ محتاج بیاں نہیں۔ پھر ان ساری پریشانیوں میں ضروری بات کہنے کا اضطراب۔ ایسی حالت ہے کہ گویا بھونچال آ گیا ہے۔ گرد و پیش کے مکان اور دیواریں پے در پے گر رہی ہیں اور ایک قلبِ حزیں دل کی تڑپ یہ ہے کہ جو کچھ بچ سکتا ہے اسے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے جائیں [۳]۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہوا لیکن آزادی ملنے کے بعد سرحد کے دونوں اطراف جو قتل و غارت گری، لوٹ مار اور خواتین کی آبروریزی ہوئی اس کا مہر کو پہلے سے اندازہ نہ تھا۔ مہر کے ایک غیر مطبوعہ خط مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۴۷ء سے اس دور کی صورت حال کا اندازہ ہوتا تھا۔ خط میں مکتوب الیہ کا نام درج نہ تھا لیکن اس میں ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء کی صحبت ہائے برہم کا ذکر تھا۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہر نے یہ خط نیاز احمد کے نام تحریر کیا تھا وہ مہر کی پہلی بیوی کے پھوپھا تھے۔ مہر نے لکھا:

> اس میں شبہ نہیں کہ ہنگامہ کے دنوں میں یہاں بھی حالات خراب رہے اور ڈاک تین چار روز تک بالکل بند رہی پھر کھلی تو اسے طبعی رفتار پر لانے میں کئی دن لگ گئے، سیاسی حالات بڑے خراب ہو چکے ہیں اور میں آج کل انہی کے باعث بہت مشکوک ہوں۔

میں آج کل اپنے بزرگانِ خاص کے ظلِ شفقت و رحمت کے لیے جس درجہ تشنہ ہوں پہلے بھی اس سے کم تشنہ نہ تھا۔

اگرچہ تشنگی کے اظہار میں بے تابی کا رنگ نمایاں نہ رہا ہو۔ اب سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی اور مطلوبِ علائق کی دولت صرف یہی تھی، اس کا ایک حصہ موت کے ہاتھوں لٹ چکا ہے، جو باقی ہے اس کے لیے دعا گو ہوں کہ کم از کم میری زندگی تک بحال رہے۔ اب یہ حالت ہے کہ زندگی کو مثلاً ایک لق و دق اور بے آب صحرا فرض کر لیجیے۔ اس میں کہیں کہیں ایک یا دو سایہ دار درخت کھڑے ہیں جن کے نیچے بیٹھ کر اس صحرا کی ماندگی اور کوفت دور کی جا سکتی ہے۔ خدا نہ کرے کہ میرے جیسا کم ہمت اور شدائد سفر سے چور مسافر آسائش کے ان محدود سامانوں سے بھی محروم ہو جائے اور پھر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے۔ میرے دل کی کیفیت آج کل ایسی ہے''[۴]۔

اپریل ۱۹۴۷ء میں مہر عارضۂ آشوب میں مبتلا ہوئے۔ یہ عارضہ پہلے جیسا شدید تو نہ تھا لیکن چند روزہ بیماری نے گزشتہ عارضے کی یاد تازہ کر دی۔ مہر نے ۱۱/اپریل ۱۹۴۷ء کے غیر مطبوعہ خط بنام نیاز احمد میں لکھا:

> مجھے پچھلے دنوں آشوبِ چشم کا عارضہ ہو گیا۔ چونکہ بارہ سال پیشتر ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء میں بھی اس مرض نے مجھے مسلسل پریشانی میں مبتلا رکھا تھا اور آپ کو یاد ہو گا کہ ایک مرتبہ بھائی سلطان علی کے ساتھ حضرت ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور کے ارشاد کی تعمیل میں مجھے گھر لے جانے کے لیے آئے تھے اور دو روز میرے پاس رہے تھے، اس لیے میں مشوش رہا کہ خدانخواستہ اس مرض کا اعادہ ہے تو خدا جانے کب تک لکھنا پڑھنا چھوڑنا پڑے۔ بارے دو چار روز جو علاج سے کسی قدر آرام ہوا[۵]۔

مندرجہ ذیل خط میں ڈاکٹر صاحب سے مراد مہر کی پہلی بیوی کے والد ڈاکٹر غلام نبی سے تھی۔ مہر نے اس خط میں شادی کے بعد کے زمانے کو یاد کیا اور جالندھر میں آباد ہونے کی آرزو کا اظہار کیا۔

> آپ کے سراپا لبریز شفقت و محبت گرامی نامہ نے ۱۷۔۱۹۱۶ء کے عہد کی یاد تازہ کر دی۔ گزرا ہوا وقت اگرچہ پھر ہاتھ نہیں آتا لیکن وہ وقت حافظہ اور اس میں ایسے گہرے اور کبھی نہ مٹنے والے نقش چھوڑ گیا ہے جن کو زمانہ کا بعد بھی کبھی مدھم نہیں کر سکتا۔ جب کبھی آنکھیں بند کر کے سوچتا ہوں تو یادداشت کی کتاب کا ایک ایک ورق یکے بعد دیگرے کھلنے لگتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی سابقہ زندگی لیل و نہار کی کتاب کا از سر نو مطالعہ ہو رہا ہے۔
>
> اے وقت کو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی
>
> زندگی کی چند آرزوئیں تھیں۔ مثلاً ایک یہ کہ آپ ریٹائر ہو کر میخانوں سے فراغت پالیسی کو ابتدائی ایام کی طرح بقیہ ایام بھی زیادہ تر یکجائی میں گزریں۔ اس آرزو کی تکمیل مشکل نہ تھی، میں نے اس غرض سے بارہا جالندھر میں ایک جھونپڑا بنانے کا ارادہ کیا اس لیے گاؤں میں رہنا بوجوہ سازگار نہیں رہا۔ وہ ارادہ اب تک پورا نہیں ہوا لیکن امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جلد پورا کر دے۔

پچھلے دنوں یہاں جو فساد ہوا اس کے بعد عام حالت اتنی بے اطمینانی کی ہوگئی ہے کہ بیان نہیں کرسکتا۔ یہاں سے ایک رات کے لیے بھی باہر نکلنا مشکل بن گیا ہے، ورنہ آرزو تھی کہ گرمیوں کی شدت سے پیشتر ایک دو روز کے لیے پھر آؤں اور کچھ کتابیں آس کے لیے لیتا آؤں تا کہ مشغولیت کا سلسلہ جاری رہے۔ اگر خدانخواستہ حالات جلد رو بہ اصلاح نہ ہوئے اور میرے آنے کی کوئی صورت نہ بنی تو میں کوشش کروں گا کہ بعض چیزیں کسی ذریعے سے آپ کو بھیج دوں[۶]۔

مہر نے نیاز احمد کے نام ۲۶/اپریل ۱۹۴۷ء کے خط میں سفر حج کے التواء کی وجوہ بیان کی تھیں اور مطلع کیا تھا کہ ۱۹/اپریل ۱۹۴۷ء کو ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا جس کا نام ۲۲/اپریل ۱۹۴۶ء کو فوت ہونے والے بچے کے نام پر مسعود طارق رکھا تھا۔ مہر نے لکھا تھا:

تشویش صرف یہ ہے کہ اول یہاں سے باہر نکلنا موجودہ خطرناک ملکی حالات میں مشکل ہو رہا ہے۔ دوم وہاں ملک کے اندر پھرنے کے وسائل بہت مشکل سے میسر آتے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ حالات ذرا سدھر جاتے تو پھر نکلتے ہیں۔ آپ کی بابرکت صحبت میں مقاماتِ ایمانی کی زیارت سے مشرف ہوتا تو خاص لذت حاصل ہوتی، خاص سرور میسر آتا۔

مئی ۱۹۴۷ء میں ماؤنٹ بیٹن کا ۳ جون ۱۹۴۷ء کا منصوبہ افشا نہ ہوا تھا لیکن تقسیم پنجاب و بنگال کے عزائم ذرائع ابلاغ کے ذریعے آشکارا ہو رہے تھے۔ مہر نے نیاز احمد کے نام ۱۰ مئی ۱۹۴۷ء کے خط میں تقسیم پنجاب کے اندیشے کا اظہار کیا تھا۔

ملک کے سیاسی حالات کے باب میں جو خاص اطلاعات دہلی سے آئیں ان سے یقین ہوگیا کہ پنجاب کے بارہ ضلعے جن میں امرتسر، جالندھر اور فیروز پور بھی شامل ہیں کٹ کر ہندو سکھ صوبے میں چلے جائیں گے، گویا پنجاب اور یہاں کا مسلمان تباہ ہو جائے گا۔

میں مزید چند روز کے لیے لاہور میں پابند ہوں۔ سیاسی حالات کے فیصلے اس مہینے کے اواخر تک ہو جانے کی خبریں سنی جاری ہیں اور سخت خوف یہ ہے کہ جالندھر پنجاب سے کٹ جائے گا۔ قائداعظم کی سیاست کا یہ پہلو میرے دل پر گہرا داغ ہے، کوشش کر رہا ہوں کہ قوم اس مصیبت سے بچ جائے، اگرچہ بظاہر بچتی نظر نہیں آتی[۷]۔ ''سیاسی حالات بدستور تشویش ناک ہیں اور امید کی جھلک آہستہ آہستہ ناپید ہو رہے ہیں''۔ مہر نے نیاز احمد کے نام ۱۶ جون ۱۹۴۷ء کے خط میں لکھا:

پرسوں شام کو یہاں شدید آندھی آئی۔ پندرہ منٹ تک ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا رہا کہ اپنے ہاتھ اور پاؤں تک نظر نہ آتے تھے۔ ذرا تاریکی کم ہوئی تو میں باہر سے اٹھ کر اندر آ گیا۔ اچانک بیٹھا، پھر اٹھا تو اٹھ نہ سکا۔ کمر پکڑی گئی حکیم صاحب کو کیفیت لکھ بھیجی۔ انھوں نے دوا تجویز فرمائی لیکن کل دن کے علاج سے افاقہ کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی، آج بڑی مشکل سے انھیں دکھانے کے لیے

شہر پہنچا۔

مہر نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کے منصوبہ آزادی کے بارے میں مندرجہ بالا خط میں لکھا:

> میں نے مختلف دوستوں اور شناساؤں سے گفتگوئیں کیں۔ دل پر یہی اثر پڑا کہ معاملے کا صرف ایک پہلو سامنے ہے، دوسرا پہلو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، وہی حالت آپ کی ہے، لیکن میں ذرا اطمینان سے بیٹھنے کے قابل ہو جاؤں تو تفصیلاً آپ کو بتاؤں کہ جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ کس قدر غلط مفروضات پر مبنی ہے اور بہترین طریقہ مذاکرہ کا ہے نہ حکایت کا[8]۔

مہر نے جون ۱۹۴۷ء کے غیر مطبوعہ خط بنام عبدالسلام اسلم میں لکھا:

> لاہور کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ پرسوں بارود خانہ میں ۶۰ گھنٹے کا کرفیو لگا تھا، ابھی موچی دروازہ میں ۴۷ گھنٹے کا کرفیو لگ گیا ہے۔ خدا جانے کیا ہونے والا ہے اور کیا ہوگا۔

مہر نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کے منصوبۂ آزادی کے بارے میں عبدالسلام اسلم کے نام غیر مطبوعہ خط میں لکھا:

> جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا اور اب لیڈر صاحبان اسی کو پاکستان ظاہر کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں، مسلمان کی تقدیر ہندوستان کے اندر ایسے چکر میں آ گئی ہے کہ اب خدا ہی کوئی تدبیر کرے تو کرے، نظر بظاہر تو بھلائی کی کوئی شکل دکھائی نہیں دیتی[9]۔

امیر احمد خاں علوی نے سناور پہنچ کر مہر کو ایک دو خط لکھے لیکن اس کے بعد ڈاک کا سلسلہ معطل ہو گیا اور مہر کا ان سے رابطہ ٹوٹ گیا اور وہ ان کے متعلق کلیتاً بے خبر رہے۔ عبدالسلام اسلم اس وقت محکمہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن میں ملازم تھے۔ انھوں نے اور مہر نے سناور اور انبالہ میں اپنے جاننے والوں کو پیغامات بھیجے کہ امیر احمد اور ان کے بچوں کی ہر ممکن مدد کی جائے اور انھیں اس کی اطلاع دی جائے۔ بعض بلند پایہ اربابِ اختیار کی طرف سے تاکیدی احکام بھجوائے لیکن افراتفری کے دور میں یہ تمام کاوشیں بے اثر رہیں۔

مہر نے اس ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد سے رابطہ کیا کہ وہ امیر احمد خاں علوی اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کو بہ حفاظت پاکستان پہنچنے میں مدد کریں۔ آزاد کے سیکرٹری محمد اجمل خاں نے ۸/اکتوبر ۱۹۴۷ء کے خط میں لکھا:

> حضرت مولانا نے اس کے متعلق فوری کارروائی کرنے کا انتظام کیا ہے اور امید ہے کہ کسولی سے وہ بہ خیریت لدھیانہ پہنچا دیے جائیں گے[10]۔

مولانا آزاد امیر احمد سے رابطہ نہ کر سکے اور نہ ہی انھیں علم ہوا کہ امیر احمد پر کیا بیتی۔ محمد اجمل خاں نے ۲۱/اکتوبر ۱۹۴۷ء کے خط میں لکھا:

> حضرت مولانا نے فرمایا تھا کہ میں خود کارروائی کروں گا بلکہ اس سلسلے میں شملہ ٹیلی فون بھی کیا گیا تھا، معلوم نہیں آپ کے بھائی لدھیانہ تک پہنچے یا نہیں اور تعجب ہے کہ آپ تک خط کیوں نہیں پہنچا[11]۔

مہر اور عبدالسلام روزانہ صبح اس امید پر شہر جاتے کہ ان کے عزیز دل کے متعلق کوئی اطلاع دفتر انقلاب میں آ جائے گی۔ اسٹیشن جا کر ٹرینیں دیکھتے رہے اور یہ سلسلہ خاصا عرصہ جاری رہا۔ ایک روز مہر تانگے میں سوار شہر جا رہے تھے، تانگہ اچھرہ اڈے کے پاس پہنچا تو محسوس ہوا کہ انھیں کسی نے آواز دی تھی۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو کسی کو نہ پایا۔ پھر غور کیا اور دوبارہ نظریں جمائیں تو ایک تانگے میں چند سواریاں مسلم ٹاؤن کی طرف جاتی دکھائی دیں۔ تانگے والے کے ساتھ والی نشست پر امیر احمد کا ڈرائیور زبیر بیٹھا تھا۔ مہر اُتر کر گئے تو پچھلی نشست پر ان کی بھاوج اور دو بھتیجیاں بیٹھی تھیں۔ وہ اس قدر بُرے حالوں میں تھیں کہ مہر کو انھیں فوراً پہچاننے میں دشواری ہوئی۔ مہر نے بے تابانہ ان سے بھائی اور دیگر بچوں کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ ''ہمیں کچھ معلوم نہیں، انھیں سناور ہی میں ہم سے الگ کر لیا گیا تھا''۔

سراسیمگی کے عالم میں مہر نے ان سے کہا کہ آپ لوگ گھر چلیں اور نہا دھو کر کچھ کھائیں، لیکن میں شہر سے خبریں لے کر آتا ہوں۔ مہر کہنے کو تو یہ کہہ گئے لیکن عالم اضطراب میں شہر جانے پر ان کا دل نہ مانا، کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد واپس گھر کی راہ لی اور ان ستم رسیدوں کی داستان سنی۔ انھوں نے بتایا کہ عورتوں اور بچوں کو سناور ہی سے کالکا بھیجنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مردوں سے کہا گیا کہ وہ پیدل کسولی جائیں اور وہاں سے پیدل کالکا پہنچیں۔ سناور سے کسولی براستہ کار چھ میل اور کسولی اٹھارہ میل دور تھا۔ لیکن یہی فاصلہ پگڈنڈیوں کی راہ سے سمٹ کر تین میل اور نو میل رہ جاتا تھا۔

مہر کی بھتیجی اور بھاوج دو کاریں لے کر نکلے۔ ایک میں یہ لوگ سوار تھے اور دوسری کار کو زبیر چلا رہا تھا۔ اس کار میں ان کا سامان اور سواریاں تھیں اسکول میں جو سامان بہ طور امانت رکھوایا تھا اس کے کاغذات اٹیچی میں تھے۔ سناور سے کاریں ٹیلے سے نیچے اتریں اور گڑکھل سے اس سڑک پر ہولیں جو سناور والے ٹیلے کے ساتھ دھرم پور کے قریب شملہ کالکا والی سڑک سے مل جاتا تھا۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ جا رہے تھے کہ پچھلی کار سے گولیاں ٹکرائیں۔ گولیاں اس طرح چلائی گئیں کہ کار کے ٹائروں پر لگیں اور انھیں بیکار کر گئیں۔ اگلی کار میں امیر احمد کی بیوی اور بچیاں تھیں وہ رکے بغیر آگے بڑھتی رہی۔ جب یہ بڑی سڑک پر آئے تو انھیں بھی روک لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اپنی کار چھوڑ کر دوسری کار میں سوار ہو جاؤ، تمہاری کار پیچھے آئے گی۔ انھوں نے حساب کتاب کا صندوقچہ اور معمولی سامان ساتھ لیا اور دوسری کار میں بیٹھ گئے۔ کالکا پہنچے تو انھیں ریل میں سوار کرا دیا گیا اور اس طرح یہ مصیبتیں جھیلتے لاہور پہنچے [۱۲]۔

مہر کے پاس امیر احمد خاں علوی کی بیگم اور دو بچیاں پہنچ گئی تھیں۔ ایک بھتیجا پہلے سے لاہور میں زیر تعلیم تھا لیکن خود امیر احمد اور ان کی بقیہ اولاد کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ دو تین دن بعد امیر احمد کا کارڈ ملا، یہ کالکا سے لکھا گیا تھا۔ اس میں درج تھا کہ وہ کسولی سے کالکا آ گئے تھے اور اسٹیشن پر ٹرین کے منتظر تھے۔ دعا کیجیے کہ مہر تک پہنچ جائیں یہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد امیر احمد کی پہلی تحریر تھی جو مہر کے ہاتھ لگی [۱۳]۔

مہر اور عبدالسلام امیر احمد علوی اور ان کے بیٹوں کے لیے نوافل پڑھتے اور دعائیں مانگتے کہ وہ بہ خیریت آ جائیں۔

مضطربانہ اسٹیشن جاتے اور ٹرینوں میں انھیں ڈھونڈتے۔ ایک روز مہر اپنے گھر کے باغیچے میں غمزدہ ٹہل رہے تھے کہ ان کا بیٹا دوڑتا ہوا آیا اور خوش خبری سنائی کہ چچا جان بہ خیریت لاہور پہنچ گئے۔

اس خبر کے ملنے پر مہر بے اختیار رونے لگے اور زمین پر دو سجدۂ شکر ادا کیا۔ مہر کے بھتیجے تو فوراً آ گئے لیکن امیر احمد کسی دوست کے ساتھ کچھ دیر کے لیے شہر میں رک گئے، یہ عرصہ مہر نے عجب عالمِ اضطراب اور کرب میں گزارا۔

امیر احمد مہر سے ملے تو ان کے دل کی حالت عجیب تھی۔ امیر احمد علوی نے دورِ مصائب کی داستان سنائی۔ امیر احمد کے لیے پیدل چلنا آسان نہ تھا۔ پہاڑ کی مرطوب آب و ہوا میں رہنے کے باعث انھیں وقتاً فوقتاً نروس کا عارضہ ہو جاتا تھا۔ ذرا سی جسمانی مشقت بھی نروس کا درد پیدا کر دیتی تھی اس عالم میں سناور سے سے کسولی اور پھر کالکا تک کا فاصلہ بارہ تیرہ میل تھا جو انھوں نے پیدل طے کیا، پھر کالکا میں کئی دن گزارے۔ رہنے کے لیے ڈھنگ کا ٹھکانہ نہ تھا۔ کھانا بھی مرضی کے مطابق نہ تھا، محض پیٹ بھرنے کا بہانہ تھا۔

وہاں سے ٹرین ملی تو پہلے جالندھر چھاؤنی رکی، آبائی وطن میں تو دور دور تک کوئی آشنا یا ہمدرد نہ تھا، ٹرین سے چند قدم بھی اِدھر اُدھر ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ریلوے لائن کے پاس بارش کا پانی جمع تھا اس سے پیاس بجھائی، جالندھر چھاؤنی سے روانہ ہوئے تو بیاس اسٹیشن پر پہنچ کر ٹرین رک گئی، یہ پہلا خطرناک مقام تھا جہاں متواتر ٹرینوں پر حملے ہو رہے تھے۔ بتایا گیا کہ ٹرین کا انجن خراب ہو گیا تھا اور امرتسر سے نیا انجن لائے بغیر آج نہیں جا سکتے تھے۔ اتفاق سے اس ٹرین کا ڈرائیور انگریز تھا، اس نے سب سے پہلے ٹرین کے اِردگرد برین گنیں اور مشین گنیں لگوائیں، پھر بیاس سے امرتسر پہنچا۔ اسلحہ دیکھ کر سکھوں کے گروہ دور ہی کھڑے رہے، ڈرائیور انجن لے آیا تو ٹرین روانگی کے لیے تیار ہوئی۔

حسنِ اتفاق سے پاکستانی فوج کی ایک ٹرین آ گئی۔ انگریز ڈرائیور نے اپنی ٹرین فوجی ٹرین کے پیچھے لگا دی۔ فوجی ٹرین امرتسر کے پلیٹ فارم پر رکی تو فوج نے خود حفاظت کے انتظامات کر لیے۔ اس طرح مفسدین اس ٹرین سے دور ہی رہے۔ ٹرین کا ڈرائیور امرتسر میں رکے بغیر آگے بڑھتا گیا اور واہگہ پہنچ کر دَم لیا۔ امیر احمد علوی اور ان کے بیٹے ۱۵ یا ۱۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور پہنچے تھے۔ اس ہجرت میں تیس چالیس ہزار کا سامان برباد ہوا۔ کسولی میں بینک میں روپیہ جمع تھا اس کا دیوالیہ نکل گیا اور وہ رقم نہ مل سکی۔ اسکول کے محافظ خانے میں جو زیورات اور کپڑے رکھوائے تھے ان میں سے ایک صندوق ایک ہندو دوست سے منگوایا۔ کھولا تو اس میں اینٹیں بھری ہوئی تھیں۔ پھر کوئی صندوق منگوانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ یہ نقصان بھی تیس ہزار سے کم نہ تھا۔ ایک ٹرک اور تین موٹریں برباد ہوئیں، اللہ کی عنایت سے امیر احمد اور ان کے بچے خیریت سے لاہور آ گئے [۱۴]۔ مہر کے ماموں چوہدری خیرالدین جن سے مہر کو بہت محبت تھی ہجرت کر کے لاہور آ رہے تھے۔ رشتے داروں کی تلاش میں یہ اکثر لاہور اسٹیشن جاتے رہتے تھے۔ کسی نے مہر کو بتایا کہ چوہدری خیرالدین بعض عزیزوں کے ساتھ ٹرین میں سوار تھے، ٹرین لاہور اسٹیشن کے بجائے شاہدرہ اسٹیشن پر جا کر رکی، مہر کو اطلاع ملی تو وہ

شاہدرہ کی طرف دوڑے۔ فیروز پور روڈ والی نہر کے پل سے چند ہی گز آگے بڑھے تھے کہ ایک عزیز آ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ ٹرین سے اترتے ہی ماموں کی طبیعت غیر ہوگئی چند منٹ بعد وہ فوت ہو گئے۔ پولیس یا مہاجرین کے نگرانوں نے انھیں پاس ہی فوراً دفن کر دیا، نہ قبر کا کوئی نشان نہ تعین مقام کے ساتھ فاتحہ خوانی کی کوئی صورت تھی۔ بے بسی میں کوئی کیا کر سکتا تھا۔ مہر کے چھوٹے ماموں علی محمد کا انتقال سال ڈیڑھ سال بعد ضلع سرگودھا کے ایک چک میں ہوا تھا، جہاں وہ ازسرنو آباد ہوئے تھے [۱۵]۔

مہر اور امیر احمد خان پھول پور کی زرعی اراضی سے محروم ہوئے، ان کا خاندان صدیوں سے وہاں آباد تھا، اس اراضی میں انھوں نے اور ان کے بزرگوں نے اضافہ کیا تھا نہایت زرخیز زمین تھی جس کی مالیت اس وقت بھی لاکھوں روپے تھی، یہ ایک ایسا سہارا تھا جس نے انھیں شفقت پدری سے محرومی کے بعد کبھی معاشی تنگی کا احساس نہ ہونے دیا اور طالب علمی اور نوجوانی کے دور میں بھی ان کے اچھے خرچ کا ضامن رہا۔ اس کے علاوہ مہر ابتدا سے کتاب اندوز رہے تھے۔ حیدر آباد دکن، بمبئی، پونا، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کابل اور مشرق وسطیٰ سے انھوں نے نادر و نایاب کتابیں اکٹھی کی تھیں ان میں اردو، فارسی اور عربی مخطوطات بھی شامل تھے۔ یہاں انھوں نے تین ہزار کتابیں جمع کی تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں ان کا کتب خانہ دیگر اشیا کے ساتھ لوٹ لیا گیا۔ انھیں علم نہ تھا کہ ان کتابوں کا کیا حشر ہوا مہر کو وطن چھوڑنے اور کتابیں ضائع ہونے کا غم زندگی بھر رہا۔

امیر احمد علوی جب لاہور آئے تو ان کے ساتھ ان ملازموں کی خاصی تعداد تھی جو سناور میں ان کے ساتھ بیکری کا کام کرتے تھے۔ یہ طباخی اور ولایتی مٹھائیاں بنانے کے ماہر تھے مہر نے سوچا کہ اگر کوئی ریستوران یا ہوٹل مل جائے تو ان لوگوں کی مدد سے امیر احمد اپنا کاروبار ازسرنو جما سکتا تھا۔ اس ضمن میں وہ ایک وزیر سے ملے اور کہا کہ ممکن ہو تو کچھ انتظام فرما دیجیے اور جو رقم اس سلسلے میں دینی پڑے گی اس کا انتظام مستقل الاٹمنٹ کے وقت کر لیں گے۔ اس نے ایک شخص کا نام لے کر کہا کہ اس سے ملو۔ اس کے پاس ہوٹل کی درخواستیں جا رہی تھیں ان سے درخواست کی جائے تو کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔

مہر اس شخص سے واقف تھے اور ایک نازک موقع پر اس کی ایسی مدد کی تھی کہ اگر وہ دس مرتبہ بھی بدلہ اتارتا تو اتار نہ پاتا۔ مہر اس کے پاس گئے، اسے ان کی آمد کی اطلاع ملی تو دو کمروں سے گزر کر برآمدے تک آیا۔ دفتر جا کر اس سے بات کی تو اس کے تیور ہی بدل گئے۔ مہر نے کہا ''میرا بھائی سب کچھ برباد کر کے آیا ہے، وہ ہوٹل کے کام سے واقف ہے اس کے ساتھ کارکردہ آدمی بھی ہیں، سنا ہے کہ درخواستیں آپ کے پاس آ رہی ہیں فلاں وزیر ہر ممکن امداد کے لیے تیار ہے، میں اپنے بھائی کے لیے درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کہیے درخواست تیار کرواؤں''۔

اس شخص کے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر ہوا کہ اسے یہ بات پسند نہیں آئی۔ مہر نے یہ دیکھتے ہوئے فرمایا کہ ''اگر آپ کے نزدیک یہ مناسب نہیں تو درخواست دینا خارج از بحث ہے''۔ اس شخص نے جواب دیا ''میرے نزدیک

درخواست دینا مناسب نہیں''۔ مہر نے کہا ''بہتر! پھر اجازت دیجیے''۔ جب مہر رخصت ہوئے تو اس نے انھیں دروازے تک چھوڑنا بھی گوارا نہ کیا، حالاں کہ جب مہر ملنے گئے تو وہ دو کمرے چھوڑ کر پیشوائی کے لیے آیا تھا۔

اس وقت جائیداد کی تقسیم میں لوگ دونوں ہاتھوں سے لوٹ مار کر رہے تھے اس عالم میں پرانی دوستی، سیاسی گزارش، جذبات اور خدمات گزاری کے احسان کو کون یاد رکھتا۔ بعد میں وہ شخص مہر سے ملنے ان کے گھر آیا تو مہر کام کا بہانہ کر کے آدھ گھنٹہ نہر پر ٹہلتے رہے اور اس کے چلے جانے کے منتظر رہے[16]۔

ایک روز مہر کے لڑکپن کے دوست شیخ مبارک علی ان سے ملنے مسلم ٹاؤن آئے۔ مہر پریشان تھے، مبارک علی نے فرمایا آج تم کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو کیا بات ہے؟ مہر نے فرمایا ''آج امیر احمد خان اوکاڑہ سے آیا تھا اور کہتا تھا کہ پچیس ہزار مل جائیں تو ایک کارخانے میں ایک حصہ خرید لوں۔ ایک سال میں یہ رقم واپس ہو جائے گی اور منافع بھی خاصا مل جائے گا۔

مہر نے مزید کہا ''ابھی حالات ایسے نظر نہیں آتے کہ کاروبار پر بڑی بڑی رقمیں صَرف کی جائیں اور اپنے اوپر ایسا بوجھ لاد لیا جائے جو خدانخواستہ نشیب و فراز کے بعد اتارنا مشکل ہو جائے۔ ابھی چھوٹے چھوٹے کام کرنے چاہییں تاکہ عزت سے گزارا ہوتا جائے۔ مبارک علی نے اس بارے میں مزید کوئی بات نہ کی، دو تین روز کے بعد امیر احمد علی آئے تو انھوں نے مہر کو بتایا کہ ''سلام (مہر کے بیٹے اور امیر کے داماد) کا خط گیا تھا، شیخ مبارک علی بلاتے ہیں میں آیا اور پچیس ہزار کا چیک شیخ صاحب نے مجھے دے دیا۔ اس وقت مہر کو اندازہ ہوا کہ مبارک علی نے رخصت ہوتے ہوئے عبدالسلام سے کہا تھا اپنے چچا کو لکھ دینا کہ وہ مجھ سے مل جائیں۔ مہر نے امیر احمد سے فرمایا کہ ''یہ رقم فوراً واپس کر آؤ، شیخ صاحب کا دلی شکریہ ادا کرو، بالفعل ضرورت نہیں خدانخواستہ ضرورت پڑے گی تو مانگ لیں گے۔

مہر کے ایک دوست نے ان سے ذکر کیا کہ ''اگر زمین لینا چاہو تو مل سکتی ہے''۔ مہر نے فرمایا اچھی جگہ اور اچھی زمین ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ خرچ کروں گا۔ ایک اتوار کو وہ دوست آئے اور کہا ''شام تک دس ہزار کا انتظام کر دو میں صبح زمین لینے جا رہا ہوں''۔ مہر اتنی جلد فراہمی رقم سے قاصر تھے، اتنے میں ایک دوست کار لے کر آئے، مہر نے ان سے کچھ دیر کے لیے کار مستعار لی اور اس میں سوار ہو کر مبارک علی کے گھر کی راہ لی۔

مبارک علی نے پوچھا ''کیا کوئی خاص کام ہے جس کے لیے آئے ہو؟'' مہر نے کام بتایا تو انھوں نے فرمایا ''اتوار کو کہاں سے رقم ملے گی؟'' پھر یکایک اٹھے اور کہا ٹھہرو! دیکھتا ہوں، چناں چہ اپنے کسی عزیز کے ہاں سے دس ہزار کی رقم لے آئے۔ مہر نے رقم تو لے لی لیکن ان کا زمین کی خریداری کا مقصد پورا نہ ہوا۔ اس وقت انھیں رنج ہوا لیکن بعد میں اس جنجال میں نہ پڑنے پر خدا کا شکر ادا کیا[17]۔

امیر احمد خاں علوی اوکاڑہ میں آباد ہو گئے۔ اس وقت ان کا ایک دوست جو سنا ور ملٹری ڈیری فارم کا انچارج رہ چکا تھا

ان کی مدد کے لیے آگے بڑھا۔ انھوں نے اوکاڑہ منڈی میں ایک دکان اور اس کے اوپر مکان امیر احمد کے لیے الاٹ کروا لیا۔ چناں چہ انھوں نے وہاں آڑھت کا کاروبار شروع کر دیا جس سے ان کا بخوبی گزارا ہو جاتا تھا۔ حالات کے تحت بالکل سادہ زندگی اختیار کر لی [18]۔ مہر تقسیم ہند کے دوران ہجرت کے تکلیف دہ واقعات، صدیوں کے جمے جمائے معاشرے کا منتشر ہو جانا اور پھول پور اور اس کے گردونواح میں آباد برادری کا پاکستان کے مختلف علاقوں میں بکھر جانا زندگی بھر نہ بھول پائے۔ زندگی کے آخری دور میں مہر نے ایک خط میں لکھا تھا ''حق یہ ہے کہ جو حالات پیش آئے وہ بے تنظیم، سراسیمگی، فجائیت اور ہنگامۂ حوادث کے اعتبار سے اس درجہ پریشان کن تھے کہ ایسی مثالیں ملنا مشکل ہے۔ گویا ایک نہایت خوف ناک طوفان یا دریا رواں تھا جو ہر خاندان کے سفینۂ خستہ کو جدھر دھکیل کر لے جا سکتا تھا وہ لے گیا''۔

اس خط میں مہر نے آگے چل کر لکھا: ''صدیوں کی یکجائی اور عزیز داری کے جتنے مستحکم رشتے تھے وہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئے، گویا قیامت کے دن کی نفسانفسی کا جو نقشہ لسانی واعظین کھینچا کرتے ہیں اس کا ایک نہایت مکمل نقشہ تھا''[19]۔

مہر کے دل سے تقسیم کے دوران لگے ہوئے گھاؤ اور آزادی کے بعد حکمرانوں کا رویہ اور انقلاب کی بندش ایسے زخم تھے جو برسوں بعد بھی مندمل نہ ہو سکے۔ ۹/ اگست ۱۹۵۲ء کے خط بنام مختیار الدین احمد میں مہر نے لکھا تھا ''اہل علم اور اربابِ ذوق رخصت ہو گئے، اب نہ علم ہے نہ ذوق۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک صحرا میں بیٹھے ہیں جہاں دور دور تک نہ کوئی درخت ہے نہ روئیدگی، نہ پانی۔ ریت ہی ریت ہے یا تیز دھوپ۔ وقت سراب کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ عرفی کا کتنا پاکیزہ شعر یاد آیا:

گلوئے تشنہ بہ دریا رساندن وارد
تمام عمر فریبِ سراب نتواں خورد

لیکن اب عمر باقی ہی کتنی رہ گئی ہے کہ فریب سراب کے شکوؤں سے دل کو پریشان اور زبان کو متحرک رکھیں۔ تاریخ کے بعض حقائق کے بارے میں ہمیشہ خلجان رہا اور معرفت کا مقام حاصل نہ ہوا۔ اب اپنی ذات پر وہ حالات گزرے تو سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ مثلاً یہ کہ لوگوں نے جانتے بوجھتے کیوں خطرات کے انسداد کی سعی نہ کی۔ یا بعض اربابِ کمال باوجود قدر شناسی کیوں شکوہ سنج رہے[20]۔

مہر کے لیے آبائی وطن سے دائمی جدائی کا صدمہ اس قدر شدید تھا کہ آزادی کے کئی برس بعد انھوں نے اپنے بزرگ نیاز احمد خان کے نام یکم جنوری ۱۹۵۳ء کے خط میں لکھا تھا:

''ہوش مندی کی زندگی شروع ہوئی تو گردوپیش کی فضا کے ذرّے ذرّے میں محبت کی جلوہ ریزیاں تھیں۔ آرزو تھی کہ اس فضا میں زندگی منزل اختتام پر پہنچے گی اور بظاہر اس آرزو کا پورا ہونا مشکل نظر بھی نہ آتا تھا لیکن بیچ میں ایک ایسی منزل

آ گئی جو خواب وخیال میں بھی نہ تھی۔ اب پہلی فضا محض دور ہی نہیں ہوئی بلکہ درہم برہم ہو چکی ہے، میں گھر سے نکلا تھا تو سمجھتا تھا کہ عارضی مفارقت ہے۔ پرندہ گھونسلے سے نکلتا ہے، دانہ دنکا چگ کر شام کو گھونسلے میں پہنچ جاتا ہے۔ میں نے گھونسلہ چھوڑا تو یہی خیال تھا کہ شام کے قریب واپس چلا جاؤں گا، سورج ڈھل گیا، غروب کا وقت نزدیک آ گیا تو دفعتاً بجلیاں چمکتی گریں، چمن کو آگ لگی۔ نہ میرا گھونسلہ باقی رہا نہ ہم صفیروں میں سے کسی کا نشیمن بچا۔ سب خاک سیاہ ہو گئے۔ اب ہم صفیروں کو جہاں جہاں جگہ ملی جا بیٹھے۔ میں جس قفس میں قید تھا وہیں کا ہو رہا، ہم صفیر اپنی موجودہ حالت پر خوش ہوں یا ناخوش، نہ میں انھیں اپنے پڑوس میں لے آنے پر قادر، نہ میرے قفس کی تیلیاں ایسی ہیں کہ انھیں توڑ کر خود نکل سکوں اور نکلوں بھی تو کہاں جاؤں، وہ مجلس ٹوٹ گئی، وہ صحبت برہم ہو گئی اور ارکانِ مجلس احباب محبت، کوئی کہیں کوئی کہیں۔ نہ ایک مقام، نہ ایک ڈیرہ، نہ ایک چمن، نہ یکجا نشیمن۔ کوئی مغرب میں ہے تو کوئی مشرق میں۔ اب انھیں کیسے جمع کروں یا ان سب کی محبت سے کیوں کر مستفید ہوں؟

''ڈاکٹر اقبال نے موت کی مفارقت اور بعد از مفارقت وصال کی ایک مثال دی ہے۔ کہتے ہیں ندی کو دیکھو، پہاڑوں کی بلندیوں میں ایک تار کی طرح بندھی چلی آتی ہے، پھر جب کسی جگہ بلندی سے نیچے گرتی ہے تو اس کا پانی قطرہ قطرہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔ لیکن چند قدم آگے بڑھ کر دیکھو تو بکھرے ہوئے قطرے مل کر پھر ویسی ہی ندی بن جاتے ہیں۔

ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثل تارِ سیم ہے''[۲۱]

مہر نے مندرجہ بالا خط میں جہاں آبائی وطن کے چھوٹنے اور احباب کی جدائی کے غم کا اظہار کیا وہیں انھوں نے شعر اقبال سے کاروانِ زندگی کی روانی اور تبدیلی حالات کے باوجود سلسلہ روز و شب کے قائم و دائم رہنے کا درس حاصل کیا تھا اور اس نے انھیں حالات کا مقابلہ کرنے اور کمر ہمت دوبارہ کسنے کا حوصلہ بخشا۔

لاہور میں فسادات کا آغاز ۲ مارچ ۱۹۴۷ء میں خضر حیات ٹوانہ کے وزارت سے مستعفی ہونے کے بعد ہوا تھا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کے سامنے کرپان لہرا کر فرقہ وارانہ منافرت کے شعلوں کو ہوا دی، لیکن فرقہ وارانہ محاذ آرائی کی بھرپور تیاری خضر دور میں شروع ہو گئی تھی۔ برطانوی ذرائع کے مطابق راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ کے ارکان کی تعداد پنجاب میں جولائی ۱۹۴۶ء میں ۸ ہزار تھی اور مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے دس ہزار رضا کار تھے۔ ایک سال سے بھی کم عرصے میں آر ایس ایس کے ارکان ۵۸ ہزار ہو گئے اور مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے کارکن ۳۹ ہزار ہو گئے۔ بظاہر تو یہ جماعتیں اپنے فرقوں کی مدافعت کی دعوے دار تھیں لیکن ان کی مشقیں، اسلحہ اندوزی اور ممنوعہ خطرناک ہتھیاروں تک رسائی ان کے جارحانہ عزائم آشکار کرتی تھیں۔ پنجاب میں موسمی کھمبیوں کی مانند فوجی تنظیمیں جنم لے رہی تھیں، ان میں وہ فوجی شامل تھے جنھیں دوسری جنگ عظیم کے بعد فوج سے فارغ کیا گیا تھا۔ ان فوجیوں نے فسادات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان کے علاوہ پنجاب کی ریاستیں جن کے حکمران سکھ یا ہندو تھے فرقہ وار تنظیموں کی مالی اور تنظیمی اعانت کر رہے تھے[۲۲]۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں فساد کے دو بڑے مراکز امرتسر اور لاہور تھے۔ فسادات سے شہری زندگی معطل ہوئی اور سرکاری نظم و نسق اس طرح متاثر ہوا کہ لوگوں کی جان و مال کی سلامتی ممکن نہ رہی۔ مدیرانِ انقلاب بھی اس صورت حال سے متاثر ہوئے۔ انقلاب کی اشاعت ۳/اگست ۱۹۴۷ء سے ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء تک معطل رہی۔

مہر نے ۲۴ جولائی ۱۹۴۷ء کے اداریے میں لکھا: ''لاہور میں ۴ مارچ سے کش مکش کا فتنہ شروع ہوا تھا۔ اس کے مختلف دوروں میں شہر کی جو حالت ہوئی اس کا صحیح اندازہ باہر کے لوگ نہیں لگا سکتے''۔[۲۳]

مہر نے اس صورت حال کے بارے میں ۳/اگست ۱۹۴۷ء کے اداریے میں اپنی مشکلات کے بارے میں لکھا:

> ہمارا دفتر اور پریس ایسی جگہ واقع تھے کہ اپنے معاصروں کی عام مشکلات کے علاوہ ہمیں خاص مصیبتوں سے بھی سابقہ پڑا۔ مثلاً جون کے مہینے میں پہلے پریس کے حلقے میں ۲۴ گھنٹے کا کرفیو لگا۔ یہ کرفیو ختم ہونے والا تھا کہ اچانک اس حلقے میں ایک حادثہ پیش آ گیا جس میں دفتر واقع ہے اور وہاں ۶۲ گھنٹے کا کرفیو لگ گیا[۲۴]۔

فتنہ و فساد کے دور میں انقلاب کو مالی نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ اخبار کے اور تاجروں کی اکثریت ہندو تھی، فسادات کے دوران ان میں سے اکثر نقل مکانی کر کے محفوظ علاقوں کی طرف کوچ کر گئے اور اشتہارات کی آمدنی سے انقلاب کو محروم کر گئے۔

مہر نے اس صورت حال کے بارے میں ۳/اگست ۱۹۴۷ء کے اداریے میں لکھا۔

> اس پانچ مہینے (مارچ تا اگست ۱۹۴۷ء) کے دوران باہر سے روپے کی وصولی بڑی حد تک معرض خلل میں پڑ گئی۔ مقامی مشتہروں اور اشتہاری ایجنٹوں میں اکثر لاہور سے باہر چلے گئے یا انھوں نے کاروبار عارضی طور پر بند کر دیا۔ ایجنٹوں نے کچھ تو روپیہ بھیجنے میں سستی کی اور کچھ محکمہ ڈاک نے تقسیم کی مجبوریوں سے تنگ آ کر ۱۶/جون سے ۱۵/جولائی تک لاہور کے نام تمام منی آرڈر، رجسٹریاں اور بیمے بند کر دیے۔ گویا ہزار ہا روپے رک گئے اور ہزار ہا کا خرچ برابر جاری رہا۔ کاروبار کے سلسلے میں جن افراد اور فرموں کے مرکز میں تھے ان کا اضطراب اس پر مستزاد ہوا۔

اس سے پیشتر اخبار کی بیس برس کی زندگی میں ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسے غیر معمولی حالات پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئے تھے، لاہور ویران ہو چکا ہے۔ اداروں کے بعض کارکن سراسیمگی کی حالت میں باہر نکل گئے ہیں خود انقلاب کے چند دیرینہ کارکن ایسے گئے ہیں کہ ڈیڑھ ماہ سے ان کا سراغ نہیں ملا اور جو کام کر رہے ہیں وہ خوف و ہراس میں مبتلا ہیں۔ انقلاب کے شعبہ اشتہارات اور مالی معاملات کے نگراں پنڈت رام ناتھ تھے۔ مہر و سالک انھیں پیار سے ''مولانا رام ناتھ'' کہتے تھے۔ لاہور کے فسادات کے دوران واجبات کی وصولی کے لیے ہندوستان گئے اور وہاں جا کر مشکلات میں گھر کر لاہور واپس نہ آ سکے۔ انقلاب کو ان جیسا محنتی اور دیانتدار منتظم دوبارہ نہ ملا[۲۵]۔

مہر ذاتی مشکلات کے باوجود قوم کی رہنمائی سے غافل نہ تھے اور اداریوں میں سیاسی مسائل کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کرتے رہے۔ انھیں ۳/جون ۱۹۴۷ء کے منصوبۂ آزادی پر سب سے بڑا اعتراض پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی منظوری پر تھا۔ مہر پنجاب کے مختلف اضلاع اور تحصیلوں میں مسلم اور غیر مسلم آبادی کے تناسب سے بخوبی واقف تھے۔ سر ساڑل ریڈکلف اپنے رفقاء سمیت جولائی ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آ چکے تھے اور پنجاب اور بنگال کی تقسیم ان کی ذمہ داری تھی۔ مہر ان صوبوں کی تقسیم کے منصوبے میں ''دیگر عوامل'' کی شرط سے وحشت زدہ تھے اور جیسا کہ ریڈکلف ایوارڈ سے بعد میں ظاہر ہوا کہ اس شق سے مسلم اکثریتی اضلاع اور تحصیلوں میں ناانصافی کا در فتنہ باز ہوا اور یہ علاقے ہندوستان میں شامل کر دیے گئے۔ مہر نے ۱۲ جولائی ۱۹۴۷ء کے اداریے میں لکھا:

> اگر تحصیلوں کو یونٹ بنایا جائے تو یہ حقیقت کئی مرتبہ عرض کی جا چکی ہے کہ مشرقی پنجاب سے پانچ تحصیلیں قطعی طور پر پاکستان میں آ سکتی ہیں۔ ضلع فیروز پور میں سے فیروز پور اور زیرہ، ضلع جالندھر میں جالندھر اور نکودر اور ضلع امرتسر سے انبالہ۔ ان پانچوں تحصیلوں میں مسلمانوں کو دوسری اقوام پر مطلق اکثریت حاصل ہے۔ ان کے برعکس ضلع گورداسپور میں سے پٹھان کوٹ کی تحصیل مشرقی پنجاب میں چلی جائے گی اس لیے کہ وہاں غیر مسلموں کو اکثریت حاصل ہے، لیکن اگر ''دوسرے عوامل'' کی تشریح وہی ہے جو ''ڈان'' نے کی ہے تو فیروز پور، زیرہ، نکودر اور جالندھر بالخصوص دو آخر الذکر کا مغربی پنجاب میں آنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا گیا ہے۔ پھر اگر متصلہ علاقوں کی تقسیم دیہہ بہ دیہہ اور موضع بہ موضع چلے گی تو یہ بھی ضروری نہیں کہ فیروز پور، زیرہ، نکودر اور جالندھر کی پوری تحصیلیں ادھر آ جائیں یا آس پاس کی پوری تحصیلیں دونوں طرف شامل کر دی جائیں۔ لیکن اگر جالندھر اور فیروز پور میں سے اسلامی علاقے کی حیثیت وہی رہے جو اس وقت سرسری طور پر نقشہ سامنے رکھنے سے واضح ہوتی ہے تو ہمیں عرض کرنا چاہیے کہ ''ڈان'' کی پیش کردہ تصریحات کی بناء پر اس علاقے کا مغربی پنجاب میں آنا غیر یقینی اور مشتبہ ضرور بن جاتا ہے۔ لیگ کے کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ معاملے پر خاص توجہ مبذول فرمائیں۔ پٹھان کوٹ کی تحصیل اگر مشرقی پنجاب میں جائے تو اپر باری دوآب نہر کا ہیڈ مادھوپور بھی ادھر چلا جائے گا اور اس طرح سخت مشکلات پیدا ہوں گی[۲۶]۔

مہر کے خدشات وہم پر مبنی نہ تھے۔ ان کا برسوں کا مطالعہ و مشاہدہ آنے والے دور میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور مشکلات کی پیش بینی کر رہا تھا۔ جولائی ۱۹۴۷ء میں آرتھر ہنڈرسن نے پنجاب اور بنگال کی حد بندی کے بارے میں برطانوی دارالعوام میں ایک بیان دیا تھا۔ (آرتھر ہنڈرسن اس وقت ایٹلی وزارت میں دولت مشترکہ امور کے سیکرٹری تھے) مہر نے ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کے اداریے میں اس بیان پر اپنا ردعمل ظاہر کیا تھا، آپ نے لکھا:

''اگر چہ حد بندی کے سلسلے میں پہلی چیز مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی متصلہ اکثریت جائز ہی ہوگی لیکن بعض صورتوں میں ''خاص عوامل'' سامنے آسکتے ہیں جن کی بناء پر اصل سے انحراف جائز ہوگا۔ مثلاً پنجاب میں سکھ قوم کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے مذہبی مقامات کی موقعیت کو معرضِ غور میں لایا جاسکے گی۔

فرض کر لیجیے کہ ۱۵/اگست سے دو چار روز پیشتر کوئی ایسا اعلان ہوگیا جو مسلمانوں کے نزدیک یا سکھوں کے نزدیک قابل قبول نہ ہو اور انگریز ۱۵/اگست کو الگ ہوگئے تو کیا باہم کشمکش کا یہ ذریعہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ناگواریوں کا سرچشمہ نہ بن جائے ۲۷۔ بعد کے واقعات نے انگریز حکمرانوں کی بدنیتی اور پاکستان کے حق میں ناانصافی نے مہر کے خدشات کو درست ثابت کیا۔ مہر نے ۵/ستمبر ۱۹۴۷ء کے اداریے میں ریڈکلف کی بندر بانٹ اور اس سے پیدا ہونے والی تباہی اور افراتفری سے متعلق لکھا:

> ہمارے نزدیک اصل اسکیم میں خرابی کے یہ تمام امکانات موجود تھے جو ہماری بدبختی اور بدنصیبی بن کر ظاہر ہوئے۔ ہم نے بارہا توجہ بھی مبذول کرائی تھی یہاں تک کہ نقشے بنا کر بھی خطرات کو پوری طرح واضح کر دیا تھا لیکن مفاسد کا دروازہ بند کرنے کے لیے جو کچھ ہونا چاہیے تھا، وہ نہ ہوسکا ۲۸۔

تقسیم ہند کے دوران پھول پور میں کتب خانے اور جائے داد کا چھننا مہر کے لیے سوہانِ روح بن گیا۔ پنجاب کی تقسیم سے مہر کے بھائی امیر احمد خاں علوی کہیں زیادہ متاثر ہوئے مہر نے محمد عالم مختار حق کے نام ستمبر ۱۹۶۱ء کے خط میں لکھا:

> دو ہزار کے قریب میری ایسی ہی منتخب کتابیں تقسیم میں برباد ہوئیں، ان میں بعض فارسی کے دو اوین بھی تھے اور بعض کتب دینیات بھی۔ پھر اچانک تقسیم بجلی کی طرح آگری۔ میں یہاں تھا، میرا چھوٹا بھائی کسولی کے پاس سناور (کوہستان شملہ) میں تھا۔ وہ اور اس کے بچے بہ مشکل جان بچا کر یہاں پہنچے۔ ۶۵ ہزار روپیہ بنک کے، تیس ہزار کا ذاتی سامان، ۳۵ ہزار کا کاروباری سامان، تین موٹریں اور ایک ٹرک وہاں برباد ہوئے۔ گھر کا سامان مع کتب گھر میں برباد ہوا، اب بھی ان کتابوں کی یاد آتی ہے تو بے اختیار جی بھر آتا ہے ۲۹۔

مہر کی پھول پور میں زرعی اراضی اور چند مکان تھے۔ مکانوں کا کرایہ ساڑھے تین ہزار روپیہ سالانہ تھا ۳۰۔ مہر نے ایک اداریے میں اپنی اور سالک کی جائیداد کا تخمینہ پیش کیا تھا۔ حالاں کہ انقلاب کے دونوں مالک مہاجر ہیں نہ کہ انصار۔ ان میں سے ایک کی جائے داد ضلع گورداسپور میں تھی اور دوسرے کی لاکھوں روپے کی زمین ضلع جالندھر میں تھی۔ مجموعی نقصان چھ سات لاکھ روپے سے ہرگز کم نہ ہوگا ۳۱۔

حوالہ جات:

۱۔ مہر، غلام رسول، غیر مطبوعہ، میرا بھائی، انہی سے رنگ گلستان، ص، ۵۲۵۔ ۵۲۴

۲۔ ایضاً، ص ۵۲۶

۳۔ خط غلام رسول مہر بنام مختار الدین احمد، نومبر ۱۹۵۷ء، نقوش، ''خطوط نمبر''، لاہور، شمارہ ۶۶۔۶۵، ص، ۹۸۱۔۹۸۰

۴۔ غیر مطبوعہ خط مہر بنام نیاز احمد، مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۴۷ء

۵۔ _____، مورخہ ۱۱/اپریل ۱۹۴۷ء

۶۔ _____، مورخہ ۲۶/اپریل ۱۹۴۷ء

۷۔ _____، مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۴۷ء

۸۔ _____، مورخہ ۱۶/جون ۱۹۴۷ء

۹ غیر مطبوعہ مکتوب مہر بنام عبدالسلام اسلم۔ جون ۱۹۴۷ء

۱۰۔ آزاد، ابوالکلام، مولانا، ۲۰۰۳ء، خطوطِ آزاد، مرتبہ: مالک رام، بک ٹاک لاہور، ص، ۲۸۵،

۱۱۔ ایضاً، ص، ۲۸۶

۱۲۔ مہر، غلام رسول، غیر مطبوعہ، میرا بھائی، انہی سے رنگ گلستان، ص، ص: ۵۲۹۔۵۲۷

۱۳۔ _____ ص ۵۳۰

۱۴۔ _____ ص ۵۳۱۔۵۳۰

۱۵۔ _____ ص ۳۷۱

۱۶۔ _____ ص ۵۳۳۔۵۳۲

۱۷۔ _____ ص ۶۳۸۔۶۳۷

۱۸۔ _____ ص ۵۳۴۔۵۳۳

۱۹۔ مکتوب مہر بنام ابوسلمان شاہ جہان پوری، مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ء، مکتوبات سامی، ص ۲۵۲

۲۰۔ مجلہ تحقیق۔ شعبہ اردو۔ سندھ یونیورسٹی، شمارہ نمبر ۱۳۔۱۲، ص ۶۰۲

۲۱۔ غیر مطبوعہ مکتوب مہر بنام نیاز احمد مورخہ یکم جنوری ۱۹۵۳ء

۲۲۔ آین تالبوت، (Ian Talbot) *Divided Cities*، آکسفورڈ، کراچی، ص ۳۸

۲۳۔ انقلاب۔ اداریہ۔ جلد ۲۲۔ نمبر ۱۳۸۔ پنج شنبہ، ۲۴ جولائی ۱۹۴۷ء

۲۴۔ انقلاب۔ اداریہ۔ جلد ۲۲۔ نمبر ۱۴۵۔ یک شنبہ، ۳/اگست ۱۹۴۷ء

۲۵۔ محمد اشرف، ۱۹۹۶ء، عبدالمجید سالک: حیات اور کارنامے، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور۔ ص ۸۱

۲۶۔ انقلاب۔ اداریہ۔ جلد ۲۲۔ نمبر ۱۲۸۔ شنبہ، ۱۲/جولائی ۱۹۴۷ء

۲۷۔ انقلاب۔ جلد ۲۲۔ نمبر ۱۳۴۔ شنبہ، ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء

۲۸۔ انقلاب۔ جلد ۲۲۔ نمبر ۱۴۶۔ جمعہ، ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء

۲۹۔ مکتوب مہر بنام محمد عالم مختارِ حق مورخہ ستمبر ۱۹۶۱ء۔ مشمولہ: ماہنامہ الرشید، اپریل ۱۹۹۲ء، لاہور۔ ص ۹۰۔۹۱

۳۰۔ احمد، شفیق، ڈاکٹر، مولانا غلام رسول مہر۔ حیات اور کارنامے، مجلس ترقی ادب لاہور، ص ۹۷
۳۱۔ انقلاب۔ جلد ۲۴، نمبر ۱۳۳۔ پنج شنبہ۔ ۹ جون ۱۹۴۹ء

Abstract

This article is about the stormy era in South Asia. The turmoil surfaced in the Punjab when Khizer Hayat Tiwana stepped down from the premiership in March 1947. The political agitation started by the Muslim League, turned into communal strife in different parts of the Punjab. The main centres of violence were Lahore and Amritsar. The Muslims were overwhelmingly in favor of Pakistan as against two wishes of Hindus and Sikhs who wanted India to be kept instead. In these circumstances All India Congress impetuously passed two resolutions to divide Punjab and Bengal on Communal basis without realizing the fact that the same formula would be applied over the whole country.

Ghulam Rasool Meher wanted Pakistan to be constituted over Muslims majority provinces without any alteration of their area. He was disheartened by communal strife and was planning to move to Jallendhar for the rest of his life. The 3rd June plan which accepted Pakistan at the cost of division of Bengal and Punjab appeared to the Muslims of India as a bolt from blue. Meher was shocked and never reconciled with it. The ultimate price was uprooting of millions Muslims and non Muslims from their ancestral homes, loss of life and property. Meher lost his ancestral home, library and fertile pieces of land in Phulpore in East Punjab.Meher never expected a fair deal from Radcliff and anticipated loss of some important Muslim majority areas in the Punjab. He was bitterly against the other two factors closes in 3rd June partition plan. Unfortunately this clause decisively went against Pakistan.

Keywords: Ghulam Rasool Meher, Punjab, Muslim league, Lahore, Redcliff.